محمد جعفر شاہ پھلواروی

اسلاف کی خدماتِ دینی اور ہم

ایک سیدھا سادا مسلمان جب نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ تفصیلات نہیں ہوتیں کہ فلاں فلاں کلمات یا حرکات فرض ہیں اور فلاں واجب، فلاں سنت مؤکدہ ہے اور فلاں غیر مؤکدہ، فلاں مستحب ہے اور فلاں مستحسن۔ بس وہ نماز پڑھتا ہے اور ان تفصیلات کو ذہن میں لائے بغیر پڑھتا جاتا ہے۔ اگر اسے زیادہ سے زیادہ صحیح نماز ادا کرنے کا شوق ہو تو اس کی کوشش یہ ہوگی، کہ جو کچھ بھی وہ زبان سے کہہ رہا ہے، اسے پوری طرح سمجھے، دل حاضر رہے، خضوع و خشوع زیادہ سے زیادہ ہو، ارکان میں تعدیل اور عمدگی ہو۔ غرض صحیح قسم کی بندگی و عبودیت ہی نماز کا مرکزی نقطہ ہے اور اسی میں فہم معانی، غور و فکر، حضورِ قلب، تذلل و انکسار اور تعدیل ارکان وغیرہ سب کچھ آجاتا ہے۔ نماز کے کلمات و حرکات ادا کرتے وقت اگر یوں سوچا جائے کہ.... قیام فرض ہے لہٰذا اس میں تو خوب دل لگانا چاہیئے اور سلام پھیرنے کا وہ درجہ نہیں لہٰذا اس میں دل لگانے کی ضرورت نہیں، یا سورۂ فاتحہ ضروری ہے اس لئے اس پر تو غور و خوض کرنا چاہیئے اور اللہ اکبر یا ربنا لک الحمد اس سے کم درجے کی چیز ہے لہٰذا اس پر دھیان دینے کی اتنی ضرورت نہیں .... یا یوں سوچا جائے کہ .... فرض نماز تو خوب اچھی پڑھنی چاہیئے اور نوافل میں اس کی ضرورت نہیں .... تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اولاً تو غیر ضروری اجزائے نماز کی طرف سے بے توجہی ہوگی۔ پھر رفتہ رفتہ ضروری اجزا کی طرف سے بھی بے توجہی ہونے لگے گی۔ غیر ضروری اجزا کا ترک کر دینا اتنا مضر نہیں جتنا کہ ان کو بے دلی کے ساتھ ادا کرنا۔ جو شخص نماز ادا کرے وہ ہر چیز کو پورے احسان (عمدگی و حسن کاری) کے ساتھ ادا کرے خواہ وہ ضروری اجزا ہوں یا غیر ضروری۔ اگر غیر ضروری اجزا میں دل نہیں لگتا تو ان کو (عارضی طور پر) ترک کر دینا اتنا مضر نہیں جتنا بے دلی سے ادا کرنا۔

ایسا کیوں ہے؟ اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ نماز کا مرکزی مقصد اظہارِ عبودیت ہے۔ (جو ساری زندگی پر حاوی و طاری ہو جانے کی ایک ضروری مشق ہے) لہٰذا جس جز سے بھی یہ مقصد پورا ہوتا ہو اُسے پورا کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ جز فرض ہو یا واجب، سنت ہو یا مستحب۔ اگر ایک مستحب جز میں یہ مقصد زیادہ نمایاں ہو تو اس کا درجہ عنداللہ اس واجب جز سے زیادہ ہے جس میں یہ مقصد پورا نہ ہوتا ہو۔ یہی مرکزی مقصد ہے جو نماز کے اجزائے متفرقہ کو ـــــ خواہ فرض ہوں یا واجب، سنت ہوں یا مستحب ـــــ فرق مراتب کے باوجود ایک وحدت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا اُصول ہے، جو پوری زندگی کے تمام اعمال و وظائف پر حاوی ہے۔ چند مثالیں سنئے:

(۱) انسانی وجود کے اندر بھی مختلف اجزا ہیں اور فرق مراتب ان کے اندر بھی قائم ہے۔ دل کی حرکت (زندگی) ایک مرکزی نقطہ ہے لیکن یہ سمجھ کر کہ فرض تو دل کی حرکت ہے آنکھوں کی حفاظت سے بے پروائی نہیں کی جاتی۔ انسان تو اپنے ایک ایک ناخن

کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ انسانی جسم اپنے تمام اجزاء کے اختلافِ مراتب کے باوجود ایک وحدت ہے۔

(۲) ستر پوشی فرض ہے لیکن یہ کوئی نہیں کرتا کہ ناف سے گھٹنوں تک تو نفیس کپڑے کا جانگھیا بنائے اور باقی لباس ٹاٹ کا بنوائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ تمام اجزائے جسم مل کر ایک وحدت ہیں۔

(۳) سانس لینا کھانے پینے سے زیادہ ضروری ہے لیکن اس کا کوئی قائل نہیں کہ ہوا تو صاف ستھری ہونی چاہیئے اور کھانا پانی سڑا ایسا بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اسکی بھی وجہ یہی ہے کہ انسان کے اندرونی مطالبات باوجود اختلافِ مراتب کے ایک وحدت ہیں۔

(۴) حتیٰ کہ خود قرآن پاک کی ساری آیتیں بھی یکساں درجہ نہیں رکھتیں۔ الحمد للہ رب العلمین ۔ ۔ ۔ ۔ اور یسئلونک عن المحیض الخ کو ایک ہی درجے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ قل العفو اور آیاتِ میراث کو برابر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ قل ھو اللہ احد اور تبت یدا ابی لھب کو ایک ہی صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اھدنا الصراط المستقیم اور کواعب اترابا سے ایک ہی طرح کا تاثر نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود پورا قرآن ایک وحدت ہے اور ہر جز کی تنزیل پر ایمان لانا ضروری ہے۔

قرآن پاک تو ایک ایسا کلمہ طیبہ ہے جو شجرۂ طیبہ[1] کی طرح ایک وحدت ہے۔ شجرے کے ظاہری اجزاء جڑ، تنہ، شاخیں، پتیاں، پھول، پھل، رگیں، چھال وغیرہ ہیں لیکن شجر انہی اجزا کی ترکیبی وحدت کا نام ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک جز بے شمار اجزا کا ترکیبی مجموعہ ہے۔ تنہا پھول کے اندر ڈنڈی، غلاف، برگہائے گل، زیرۂ گل اور خدا جانے کیا کیا کچھ ہوتا ہے اور ان میں ہر ایک چیز الگ الگ اللہ جانے کتنی دوسری ترکیبوں کا نام ہے۔ ان تمام کثرتوں کے باوجود پھول ایک وحدت ہے اور اسی طرح تمام اجزائے متفرقہ کے ہوتے ہوئے بھی پورا شجرہ ایک وحدت ہے۔ اس میں ظاہری اجزائے محسوسہ کے علاوہ کچھ اور اندرونی اجزا بھی ہیں جو مرئی طور پر محسوس نہیں ہوتے۔ اس کی قوتِ جذب، قوتِ تحلیلی اور قوتِ نمو، قوتِ تاثیر اور قوتِ شعوری[2] اور اللہ جانے کتنی اور چھپے ہوئے اجزائے ترکیبی ہیں جو نظر نہیں آتے۔ شجرہ ان تمام ظاہری و باطنی اجزا اور اجزا کی دنیاؤں کو سمیٹے ہوئے خود ایک وحدت کی شکل میں کھڑا ہوتا ہے۔ یوں کہئے کہ ان سارے اجزا کے ایک مجموعی "انا" (E.G.O) کا نام درخت ہے۔ (اس سے بحث نہیں کہ اسکی "انا" کیسی ہے؟)

بلاشبہ درخت کے تمام اجزا کا یکساں درجہ نہیں۔ خود غرض انسان صرف آم کھا لیتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھنے کی وجہ سے گل و برگ اور شاخ و اصل کو کچھ نہیں سمجھتا حالانکہ ہر جز کا اپنا ایک خاص مربوط و منطقی مقام ہے۔ اگرچہ مراتب میں فرق ہے مگر ہر جز اتنا ہی اہم ہے جتنا دوسرا۔ ہاں یہ اہمیت اسی وقت تک ہے جب تک ہر جز کا رخ اصلی و مرکزی مقصد کی طرف مڑا رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہی صورت نماز کی بھی سمجھ لیجئے۔ اس کے جس غیر واجب جز میں روحِ عبودیت موجود ہو وہ اتنا ہی اہم اور مفید ہے جتنا ضروری جز سے پیدا ہونے والی روحِ عبودیت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ ہم ایک اور حقیقت کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں کہ غیر ضروری جز اگر اہم مقصد کی

---

[1] مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔

[2] جمادی ذرات کو نباتی مواد میں تبدیل کر لینا پودے کی قوتِ تحلیل ہے مختلف قسم کے مفید اور مضر اثرات اسکی قوتِ تاثیر ہے۔ کدو کی بیل جدھر جا رہی ہو اسکی مخالف سمت میں ایک لکڑی گاڑ دیجئے تو بیل اپنا رُخ اس لکڑی کی طرف بدل لے گی یہ ہے اس کی قوتِ شعوری۔ یہی قوتِ جذب اور قوتِ نمو تو وہ بالکل واضح حقیقت ہے

تکمیل کر رہا ہو اس ضروری جز سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے جو اُس وقت کسی اہم مقصد کو نہ پورا کر رہا ہو۔ آپ کے کمرے میں اعلیٰ سے اعلیٰ سوفے سیٹ، بہتر سے بہتر قالین، عمدہ سے عمدہ سامانِ آرائش و زیبائش، قیمتی سے قیمتی کتابیں اور اشرفیوں کے توڑے رکھے ہوں لیکن ایک سانپ دکھائی دینے کے بعد چار پیسے کا ڈنڈا ان سارے انمول ذخیروں پر بھاری اور ان سب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے کیونکہ اس وقت اس سے زندگی کا پورا رُخ بدل جاتا ہے۔ بلاشبہ اھدنا الصراط المستقیم سے بہتر کوئی دعا نہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے جبکہ رب ھب لی من لدنك ذریۃ طیبۃ اور رب لاتذر علی الارض من الکفرین دیارا سب سے بڑی دعا ہوتی ہے۔ ایک "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" پوری نماز پر بھاری ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کی قیمتی اقدار صرف قرآن کی کسی مخصوص آیت ہی سے حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کے کچھ اور بھی راستے ہیں اور سب وہیں پہنچتے ہیں جہاں پہنچنا مقصودِ حیات ہے۔ اور وہ سب راستے دین کی وحدت کے مختلف اجزا ہیں۔ انکے مراتب میں بلاشبہ فرق ہے لیکن ہر راستے کا اپنا اپنا مقام ہے اور بعض وقت ایک ادنیٰ راستہ شاہراہ سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے ـــــ

حکیم یہ کبھی نہیں دیکھتا کہ کونسی دوا کتنے پیسے میں آتی ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے مریض کو کونسی دوا مفید ہو سکتی ہے؟ دوا دو ہزار روپے کی ہو لیکن اس مرض کے لئے سودمند نہ ہو تو مریض کے لئے دو کوڑی کی بھی نہیں اور دو پیسے کی ہو لیکن مفید ہو تو وہ دو ہزار روپے والی دوا سے زیادہ قیمتی ہے۔ روحانی امراض کی بھی بیشمار قسمیں ہیں اور مریض کی ذہنی سطحیں بھی بے شمار ہیں۔ حکیم کا کام یہ ہے کہ وہ ایسی دوا تشخیص کرے جو اس کی ذہنی سطح اور ظرف کے مطابق ہونے کے علاوہ زیادہ سے زیادہ مفید بھی ہو۔

لیکن ہمارے موجودہ حکماء کا انداز یہ ہے کہ وہ مریض کی ضرورت پر نظر ذرا کم رکھتے ہیں۔ البتہ دواؤں کی قیمت متعین کرنے میں زیادہ انرجی صرف کرتے ہیں۔ مریض کی جان نکلی جا رہی ہے اور حکما کے جھگڑے یہ ہیں کہ:

وحی صرف قرآن ہے اور وہی کافی ہے جو اس کے علاوہ کسی وحی کو مانتا ہے وُہ گمراہ ہے۔

حدیث شریف کے بغیر قرآن بے معنی ہے۔ اس کی تفہیم کے لئے ایک وحی خفی کو ماننا بھی ضروری ہے

قرآن اور حدیث دونوں فقہ کے بغیر بے کار ہیں۔ اصل چیز فقہ ہے، پہلے اس کو مانو۔

یہ سارے علوم صرف ظاہری شریعت ہیں۔ اس سے کچھ نہیں بنتا۔ مغزِ قرآن ہم صوفیوں کے پاس ہے۔

نغمہائے حجازی کا قاری بننے سے کیا ہوگا؟ پہلے اسے تلاش کرو جو اپنی آستینوں میں ید بیضا لئے پھرتے ہیں۔

غرض ہمارے حکما ابھی قرآن، حدیث، فقہ، لغت، تصوف وغیرہ کی قدر و قیمت دریافت کرنے اور مقام متعین کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور مریض آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے، گویا معالج مریض سے یہ کہہ رہا ہے کہ پہلے یہ مان لو کہ "ٹیرامائی سن" کی قیمت پچاس روپے ہے اور پنسلین صرف ایک روپے میں آتی ہے۔ اور گل بنفشہ کی قیمت دو آنے سے زیادہ نہیں۔ جب تک تم ان کی قیمتوں پر ایمان نہ لاؤ گے اُس وقت تک تمہیں کوئی دوا فائدہ نہ کرے گی۔ اور نہ تمہارے لئے کوئی نسخہ تجویز کیا جائے گا۔ ہر حکیم کسی خاص دوا کے متعلق یہ طے کر کے بیٹھ گیا ہے کہ خواہ کوئی سا مریض ہو کسی اسٹیج میں ہو اس کو فلاں دوا ہی دی جائے گی کیونکہ ہماری فہرست ادویہ میں اسکی قیمت

زیادہ ہے۔ اور کوئی دوسری دوا صرف اس لئے نہیں دی جائیگی کہ اس کی قیمت کم ہے۔

حکیم کا فرض یہ ہے کہ پہلے مریض کے مرض کو سمجھے، مزاج کو دیکھے پھر اس کے لئے کوئی مناسب نسخہ تجویز کرے۔ ایک دینی معالج کو پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس فرد یا قوم سے اسے سابقہ ہے اس کا قومی مزاج کیا ہے؟ وہ کس قسم کا مریض ہے اور اسکی طبیعت کس قسم کی دوا کو قبول کر سکتی ہے؟ ایک آزاد منش فلسفی کو یہ بتانا کہ قرآن شریف میں یوں لکھا ہے زیادہ مؤثر نہیں ہوتا یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی "اہل قرآن" کو یہ کہنا کہ حدیث شریف میں یوں آیا ہے یا ایک اہل حدیث سے یہ کہنا کہ حنفی فقہ کی کتابوں میں یوں لکھا ہے یا ایک صوفی کو یہ بتانا کہ فلاں ادیب یوں کہتا ہے یا ایک عامی آدمی کو یہ بتانا کہ ارسطو کا یہ نظریہ ہے۔

سارے معدوں کی ساخت یا صلاحیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کچھ غذاؤں اور دواؤں کو بعض معدے قبول کرتے ہیں اور بعض قبول نہیں کرتے اسی طرح بعض اذہان بھی کسی خاص طرزِ تعلیم یا مخصوص اندازِ گفتگو کو قبول کرتے ہیں اور دوسرے اسے قبول کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ صلاحیتیں کچھ موروثی ہوتی ہیں اور کچھ ماحول کی پیدا کردہ اور کچھ فطری۔ ایک ہی لاٹھی سے سبھوں کو ہانکنا ایسا ہی ہے جیسے ایک ہی نسخہ ہر مریض کے لئے تجویز کرنا۔

اگر آپ سے ایک جامد مقلد فقیہ گفتگو کر رہا ہے تو اس کی تسکین کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ قرآن پاک کی آیت اس بارے میں یوں ہے۔ آپ بالکل صحیح بات بھی کہہ رہے ہوں تو اس فقیہ کے سامنے اپنے مسلک کے فقہا کا ایک لگاتار سلسلہ آجاتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے یہ آیت نہ تھی؟ کیا ان کے سامنے یہ تعبیر نہ آئی ہوگی جو اب بیان کی جا رہی ہے؟ کیا مخاطب کا علم تقویٰ، دیانت اور فہم فقہا سے زیادہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس فقیہ کی ذہنی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور ہے اور ایک جست میں اپنی ساری عمر کی محنت و کسب سے دستبردار ہونا اس کے لئے مشکل ہے۔ اگر آپ اس فقیہ کو اپنی بات سمجھانا چاہتے ہیں تو قرآنی آیت کے خاکے میں فقہ کا رنگ بھر کر پیش کیجئے کیونکہ اس کے وصول الی المقصد کے لئے یہی قریب کا راستہ ہے۔

اسی طرح ایک صوفی منش کے سامنے صرف قرآن و حدیث پڑھ کر سنا دینا کافی نہیں۔ اسے پہلے تصوّف کے وہ اعلےٰ اقدار بتائیے جسکی راہ سے وہ چل کر اصل مقصد تک پہنچ سکے۔ یوں ہی ایک اہلِ حدیث کو کچھ حدیثیں بھی سنائیے کیونکہ اسکی تسکین اس کے بغیر نہیں ہوگی۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو ہم یہ بھی عرض کریں کہ ایک مسیحی کے سامنے انجیل کے اندر سے وہ اعلیٰ قدریں نکال کر رکھئے جو اسے قرآن سے قریب کردیں۔ ایک مسیحی بخاری یا رومی یا ابن تیمیہ کی وساطت سے آپ کا مقصد نہیں پا سکتا۔ اس کی فطرت میں ذاتِ مسیح پیوست ہے اور وہ اسی راہ سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ آپ کا کام صرف سمتِ صحیح متعین کرنا ہے۔ مسیح سے اس کی فطری وابستگی کو ختم کرنے میں جتنی کوشش بھی آپ کریں گے وہ ضائع جائیگی یا الٹا ردعمل پیدا ہوگا۔ مسیح کی وابستگی وہ جتنی بھی رکھ سکتا ہے اسے رکھنے دیجئے، آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس وابستگی میں توحید کی روح سما جائے۔ یہ مختلف "اقطار" سے آنے والے مرکزِ دائرہ سے جتنے بھی نزدیک آتے جائیں گے اسی قدر باہم قریب ہوتے جائیں گے۔ اور نقطۂ توحید پر پہنچنے کے بعد متباعد نقطہائے آغاز ختم ہو جائینگے اور من و تو کا فرق بھی جاتا رہے گا۔ اس راستے میں بعض دشواریاں ضرور ہیں لیکن یہ نہ تعجب کی بات ہے نہ گھبرانے کی۔ صحیح کام غلط کام کی نسبت

دشوار تر ہی ہوا کرتا ہے۔ اس کی دشواریاں یہ ہیں کہ:

مخاطب کے پسندیدہ مسلک اور لٹریچر میں سے ان اعلیٰ اقدار کو چھانٹ کر محفوظ کرنا ہوگا جو اسے قرآنی اقدار سے قریب کریں۔ اور یقین کیجئے کہ ہر قسم کے دینی لٹریچر میں ایسی چیزیں موجود ہیں۔ ضرورت تلاش و محنت کی ہے۔

ایک بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ قرآن کے سوا ہر لٹریچر میں لفظی و معنوی تحریفات واقعات ہوئے ہیں خواہ وہ حدیث ہو یا فقہ یا تصوف یا کچھ اور، اس لئے مخاطب کے سامنے ترکِ بعض اور اخذِ بعض بڑی ذہنی پیچیدگی کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر آپ اس حصے کو مانتے ہیں تو دوسرے حصوں کو بھی مانئے (خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہوں)۔ اس دشواری کا بعض لوگوں نے حل یہ نکالا ہے کہ حدیث کے پورے دفتر کو، فقہ کے سارے ذخیرے کو اور تصوف کے سارے لٹریچر کو ختم کر دو اور یہ کہہ کر الگ ہو جاؤ کہ قرآن کے سوا چونکہ کوئی چیز محفوظ وحی نہیں اس لئے سب کچھ ظنی ہے اور قرآن یقینی ہے۔ لہٰذا سب کچھ قرآن ہی میں سے لو۔ باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں ـــــ یہ طریقِ استدلال ہر ایک کے لئے تسلی بخش نہیں۔ خود قرآن نے بھی یہ انداز اختیار نہیں کیا ہے۔ قرآن بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ چونکہ پچھلے تمام صحائفِ آسمانی اور تاریخ انبیا میں تحریف ہو چکی ہے اس لئے اب ان کا کوئی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے اندر سب کی اصلی تعلیم موجود ہے لہٰذا ماضی سے کوئی سلسلہ و ربط قائم رکھنا غیر ضروری ہے۔ بس ہم پر ایمان لا کر باقی سبھوں سے بے تعلق ہو جاؤ۔ ورنہ جاؤ جہنم میں۔ لیکن اس کا انداز مکالمہ یہ ہے کہ وہ بار بار بکثرت تمام انبیا کا ذکر کرتا ہے۔ ان کی تعلیمات کو پیش کرتا ہے۔ صحیح کو پیش کرتا اور مستقیم کی تصحیح یا تنقید کرتا ہے صحائفِ آسمانی کی تصدیق کر کے اپنے آپ کو ان کا مہیمن کہتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہتا ہے کہ اہلِ توراۃ یا اہلِ انجیل اپنے "ما انزل اللہ" کے مطابق فیصلے کریں۔

مگر ہمارا انداز اس سے مختلف ہے۔ ہم قرآن کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ آج ہی نازل ہوا ہے۔ اس کا ماضی سے کوئی ربط و تعلق نہیں۔ کوئی تاریخی پس منظر نہیں۔ اس کی کسی زمانے میں کوئی صحیح تعبیر نہیں ہوئی۔ اس کی عملی تشکیل کی کوئی قابلِ ذکر کوشش نہیں ہوئی۔ نیز صدیوں میں صحتِ تعبیر و تشکیل کے لحاظ سے پورا زمانی خلا (GAP) رہا۔ سازشِ عجم کی تاریکیوں میں کہیں کوئی جگنو بھی نہیں چمکا۔ جو کچھ ہوا غلط ہوا۔ تاریخ غلط، تفسیر غلط، احادیث و روایات غلط، لغات غلط، فقہ غلط، ادب غلط، تصوف غلط، رجال غلط، اسناد غلط، سب کچھ غلط ـــــ صرف ہم صحیح ـــــ گویا غلط میں تو بے شک ایک پورا زمانی تسلسل رہا لیکن صحت کے لحاظ سے یہاں سے وہاں تک غیر منقطع خلا ہے۔

غلط کو غلط کر کے دکھائیے۔ اس سے کون روکتا ہے، ہم بھی اس کے عملاً مؤید ہیں لیکن صحیح کو بھی صحیح کر کے دکھانا چاہیئے۔ یہ سارے کا سارا دینی لٹریچر شروع سے آخر تک غلط نہیں۔ یہ انداز ٹھیک نہیں کہ . . . . چونکہ فلاں کتاب میں فلاں فلاں باتیں غلط ہیں لہٰذا پوری کتاب ہی ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ چونکہ ہم انسان ہیں اور انسان سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، لہٰذا ہر انسان اور خود ہم بھی مع اپنی ساری تعبیراتِ قرآنیہ کے غلط اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ آخر یہ کیا منطق ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ چونکہ قرآن میں بعض احکام وقتی ہیں لہٰذا سارا قرآن ہی وقتی ہے، یا یہ کہ ہر لغت میں چند غلطیاں موجود ہیں لہٰذا پورا علمِ لغت

سازشِ عجم ہے۔ تاریخ میں بھی بے شمار اغلاط ہیں لہٰذا پورا دفترِ تاریخ ہی بے معنی اور غرق مے ناب کرنے کے لائق ہے۔ قدرت نے سونے کی اینٹیں کہیں نہیں پیدا کیں۔ اس نے کروڑوں ٹن کے پتھریلے پہاڑ پیدا کر دیئے ہیں۔ اور انسان بڑی جانفشانی کے بعد بیسیوں ٹن پتھر میں سے ایک ایک ذرہ الگ کر کے ایک تولہ سونا پیدا کرتا ہے۔ آپ بھی کانی میں سے زرِ خالص کے ڈھیر نکال سکتے ہیں یہ بھی قرآن ہی کی طرح "کلمات اللہ" ہوں گے۔ آپ سائنس کے جواہم انکشافات کریں گے وہ بھی "کلمات اللہ" ہی ہوں گے۔ ان سے صرفِ نظر کی تعلیم قرآن نے نہیں دی بلکہ وہ ادھر متوجہ کرتا ہے۔

مقصد صحیح اقدار کا پیدا کرنا ہے۔ صحیح اقدار جہاں بھی ہوں گی وہ قرآنی اقدار ہی ہوں گے۔ اسے برآمد کرنے کیلئے قرآن دوسرے ذخائر سے استفادے کو حرام نہیں کرتا۔ بلکہ بعض خاص سطح کے اذہان ایسے ہیں جو قرآن سن کر بات کی تہ تک نہیں پہنچتے اور کسی مرد درویش کی ایک نگاہ یا ایک بات انھیں حقیقت سمجھا دیتی ہے۔ ایک حدیثِ رسولؐ ان کی سمجھ میں نہیں آتی اور کسی فقیہہ کی ایک بات سن کر وہ کچھ کا کچھ بن جاتے ہیں۔ مجتہد کے قول سے کچھ بھی اس کے ہاتھ نہیں آتا اور ایک حکیم و فلسفی کے دو کلمے سن کر اس کی سیرت بدل جاتی ہے۔ غرض ایک قیمتی دوا اس کے لئے سودمند نہیں ہوتی اور دو پیسے کی دوا سے صحتیاب ہو جاتا ہے۔ مقصد اصلاح و ارتقا ہے خواہ جس ذخیرۂ علم اور جس معلم کے وسیلے سے ہو۔ جس کو جس دوا سے فائدہ ہوتا ہو اس سے اسے روکنے کی کیا ضرورت ہے؟

ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ طریقۂ تعلیم و اصلاح مفید یا ضروری ہونے کے باوجود ایک ابتدائی قدم ہے۔ آخری منزل نہیں۔ اس ذریعے سے قرآنی تعلیم تک لے جانا اصلی مقصد ہے پھر قرآن کریم بھی خود اپنی ساری تفصیلات کے ذریعے انسان کو اپنی پیش کردہ ابدی اقدار اور پھر قدر الاقدار کی طرف آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ انسان انفرادی اور اجتماعی ہر دو حیثیتوں سے ارتقا پذیر ہے لہٰذا اس کا قدم کہیں نہ رکنا چاہیئے لیکن کوئی قدم آگے بڑھنے کے بعد اس کا پچھلا نقشِ قدم بے کار نہیں ہو جاتا بلکہ پیچھے آنے والوں کے لئے نشانِ راہ کا کام دیتا ہے۔ ہمارا تیرہ صدیوں کا سارا لٹریچر نشانِ راہ ہی ہے۔ ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ماہنامہ ثقافت کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔ جنوری کے شمارے میں ہم نے اسے یوں ادا کیا تھا:

> "اسلاف کی علمی و فکری اور اخلاقی و روحانی خدمات کو از اوّل تا آخر بے معنی سمجھ کر رد نہ کر دینا ثقافت کے نزدیک کوئی دینی خدمت نہیں۔ اس لئے وہ اپنے ہی سرمائے کو بھی خاص سلیقہ و ترتیب سے پیش کرے گا کیونکہ حکمت اور صداقت جہاں بھی موجود ہو ہماری ہی گم شدہ دولت ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بیشمار صداقتیں اس سرمائے کے اندر محفوظ ہیں، اور علوم و فنون کا لاانتہا سمندر بھی ان میں موجزن ہے۔ ان کو یکسر ترک کر دینا کوئی علمی یا دینی خدمت نہیں۔ تمدن کے پھیلاؤ کے ساتھ علوم و فنون بھی پھیلتے ہیں۔ زندہ قومیں انھیں ختم نہیں کرتیں بلکہ ان میں حک و اضافہ کر کے اور مزید وسعت دے کر ارتقا پیدا کرتی ہیں۔ "ثقافت" جس ادارے کا ترجمان ہے اس کا بھی یہی مقصد ہے کہ اسلاف کے علمی سرمائے سے دین کی تقویت و تائید کا فائدہ اٹھایا جائے۔ ماہنامہ ثقافت بھی اس خدمت کو انجام دیتا رہے گا۔ (ثقافت شمارہ جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ ۵)

ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا یہ انداز سنّتِ نبویؐ ہی کا اتباع ہے۔ اس کی ایک نظیر ملاحظہ ہو:

۹ھ میں عدی ابن حاتم حضورؐ کا ذکر سن کر خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضورؐ ان کو ایک چمڑے کے گدے پر بٹھلاتے اور خود زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور سلسلۂ کلام یوں شروع ہوتا ہے:

تم رکوسی (ایک عیسائی فرقہ سے) ہو؟

جی ہاں۔

تم اپنی قوم سے غنیمت اور پیداوار لیا کرتے ہو؟

جی ہاں۔

مگر یہ تمہارے دین میں جائز تو نہیں؟

حضور سچ فرماتے ہیں

تمہیں داخلِ اسلام ہونے سے تین خیال مانع ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ اہلِ اسلام غریب ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے دشمن بہت ہیں تیسرے ان کے پاس حکومت نہیں لیکن عدی عنقریب ان میں اتنی دولت ہو جائیگی کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ رہے گا۔ اور عنقریب ایک عورت قادسیہ سے مکے تک بے خوف ہو کر سفر کرے گی۔ اور جلد ہی یہ امت بابل کے سفید محل میں داخل ہو گی تمہیں لا الٰہ الا اللہ یا اللہ اکبر کے اقرار میں کیا تامل ہے۔ کیا واقعی خدا کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے یا اس سے بڑا کوئی اور ہے؟ عدی اس کے بعد ایمان لے آئے۔

تاریخ طبری وغیرہ میں عدی بن حاتم کے ایمان لانے کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ یہ اس کا خلاصہ ہے۔ ہمیں اس سے صرف یہ سبق ملتا ہے کہ حضورؐ نے توحید کی دعوت دینے سے پہلے گفتگو کا آغاز عیسائیت کے ذکر سے کیا اور عدی کی ایک دکھتی رگ پکڑ لی۔ یہ نہیں فرمایا کہ میں تو انجیل کو منسوخ کر چکا ہوں۔ قرآن کو مانو اور انجیل سے باز آؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ مخاطب پر خود مخاطب کے مسلمات پیش کرنے کا جو اثر ہوتا ہے وہ اپنے مسلمات پیش کرنے کا نہیں ہوتا۔ اپنے مسلمات تک اسے خود اسی کے مسلمات کی راہ سے لانا زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک اس اسلوب کو بار بار کام میں لایا ہے۔ مثلاً ... تم یہ مانتے ہو کہ اللہ ہی پانی برساتا ہے۔ وہی موت و حیات کا مالک ہے، وہی ارض و سما کا خالق ہے ..... وغیرہ وغیرہ، تو اسے الٰہِ مطلق ماننے میں کیا مانع ہے؟ یا ..... تم یہ مانتے ہو کہ مسیح انسانوں کی طرح پیدا ہوئے اور آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے تھے وغیرہ وغیرہ، تو انہیں بشر ماننے میں کیا تامل ہے؟ یا ..... تم اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہو تو ابراہیمؑ کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ غرض بے شمار جگہ قرآنِ پاک نے تخاطب کا یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ پس اگر آج ہم بھی یہی انداز اختیار کریں تو یہ عین اتباعِ سنّتِ الٰہی اور اتباعِ سنّتِ نبویؐ ہوگا۔ ہمارے نزدیک اپنے اسلاف کے تمام علمی سرمائے سے اسی انداز سے فائدہ اٹھانا چاہیئے کہ وہاں جو اعلیٰ قدریں ہیں ان کو اجاگر کیا جائے لیکن ہماری عام عادت یہ بن چکی ہے کہ اسلاف کی گرانقدر خدمات سے فائدہ تو نہیں اٹھاتے مگر ان کی لغزشوں کو خوب اچھالتے ہیں۔